لگانے میں تو کامیاب ہو گیا تھا۔ لیکن اب اس کے دل میں اپنے باپ کے خلاف
دبا دبا بغض اکٹھا ہو رہا تھا۔ جو کارک لگانے کے باعث بڑی شدت کے ساتھ تنخیہ
صورت میں جمع ہونے لگتا ہے۔ وہ اپنے باپ سے بیک وقت نفرت اور محبت
کا شکار ہو چکا تھا۔

یہ کون ہوتے ہیں مجھے منع کرنے والے؟
یہ کون ہوتے ہیں مجھ پر پابندی لگانے والے؟
وہ کون ہوتی ہے ان سے شکایت کرنے والی؟
یہ کیوں ہوا کہ میں نے ان سے وعدہ کر لیا؟
اور ایسے کیوں ہے کہ میں یہ وعدہ توڑ نہیں سکتا؟

ظفر کی طبیعت میں بلا کی شدت تھی۔ جو کیفیت اٹھتی اس میں مدوجزر کی
صورت ہوتی۔ پھر جب تک یہ کیفیت طاری رہتی۔ وہ اتھلے پانیوں میں کبھی
اترتا۔ گہرے عمیق پانیوں میں پتوار کے بغیر کشتی دوڑائے پھرتا۔ جب سے رشید
کو خط لکھنے کا سلسلہ بند ہوا تھا۔ وہ پہلے تو غصے اور غم میں بپھرا۔ پھر اس پر
ایک گہری حزنیہ کیفیت طاری ہو گئی۔ وہ اندر ہی اندر فیٹس بن گیا۔ اور رحم کی
اندھیری چھاگل میں زانو سے سر لگا کر ایک سوالیہ نشان بنا وقت گزارنے لگا
اب اس کا زیادہ وقت باغوں میں کٹنے لگا۔ کبھی باغ جناح میں جا بیٹھتا
کبھی جہانگیر کے مقبرے میں پناہ لیتا۔ جب شام کو کوے کائیں کائیں کرتے غول در

خول گھروں کو لوٹتے تو وہ بھی موٹر سائیکل لے کر گھر آجاتا۔ سب سے زیادہ اسے
نور جہاں کے مزار کا چسکا پڑا۔ اس مقبرے میں جو خستگی بے چارگی اور اندھیرا تھا وہ
ناظر کی طبیعت کے ساتھ میل کھاتا تھا۔ وہ اپنی کتابیں گھر سے لاتا اور انہیں اندھیروں
میں منہ دیئے پڑھتا رہتا۔ ان دنوں اس کے ساتھ سائیکلوجی سے زیادہ مختلف
مذاہب کی کتابیں ہوتیں۔ کنفوشش، کپل وستو کے سدھارتھ، زرتشت، بہائی فرقہ اور
صوفیہ کرام کے متعلق اس نے بہت کچھ پڑھ لیا۔ گندم جو، مکئی اور ساری دالیں مل کر
اس کے اندر ایک ایسا حلیم پکانے لگیں جس کی خوشبو سے خود اس کا اپنا وجود منہال کی
طرح بوجھل ہو گیا۔ رشو کی محبت سیر بین کی طرح کئی روپ دھارتی۔ کئی زاویوں سے
اسے برماتی۔ بہت مذہب کا سہارا پکڑتا۔ کئی طور اس جذبے پر کمند پھینکتا۔ اس
منہ زور گھوڑے کو زانوؤں میں دباتا۔ لیکن رشو سے محبت کچھ اکتسابی علم نہ تھا
تو ایک وجدانی کیفیت تھی جیسے صبح سویرے کوئی دھن کانوں میں رچ بس
جائے۔ اولاً مارادن ذہن میں دل میں کانوں میں شریانوں میں بھونرے کی گونجار
بن کر گونجتی رہے۔ محبت سے تو وہ پیچھا نہ چھڑا سکا۔ لیکن مذہب کی لاٹھی ٹیکنے کا
ایک فائدہ ضرور ہوا۔ اس میں ایک قسم کی مثبت قوت مدافعت پیدا ہو گئی۔ پہلے وہ
رشو کو خط لکھنا چاہتا تھا۔ رشو کے قدموں کو پکڑ کر اسے یروشلم کی کسبی کی طرح
اپنے آنسوؤں سے دھونا چاہتا تھا۔ وہ رشو کو اپنے بازوؤں کے حصار میں
مادر کلی کی طرح دفن کرنا چاہتا تھا۔ لیکن دکھ اور صبر نے ایمان کی ایک اور راہ

متعین کر دی تھی۔

ایک روز ارشاد ہوا:

کہ جہانگیر بادشاہ کو شاہ حسین ڈھڈا کی زیارت کا دلی شوق و اشتیاق ہوا۔ مصاحبوں نے عرض کی کہ حضور وہ تو لکڑی کا گھوڑے بنائے اسپر سوار بچوں کے ساتھ کھیلتا ہے۔ نہ عزت داروں کا پاس رکھتا ہے نہ منصف مزاج ہے۔ ایسوں سے شاہوں کا اختلاط چہ معنی دارد۔ اتفاقاً جس روز جہانگیر نے قصدِ زیارت کا کیا، اسی رات وہ فقیر مجذوب صورت جھروکا شاہی تلے آنکلا۔ کسی نے شاہ کو خبر کی کہ آپ کے جھروکے کے نیچے شاہ حسین بہ نفسِ نفیس آموجود ہوتے ہیں۔ اگر ارادہ زیارت کا ہو تو طلب فرمائیے۔ بادشاہ نے جھٹ پٹ کمند لٹکا دی فقیر کو اوپر کھینچ لیا۔ کچھ دیر باہم اخلاص کی باتیں ہوئیں پھر بادشاہ نے پوچھا کہ اے دینِ اسلام کے چراغ یہ بتا تجھے خدا کیسے ملا۔ جواب ملا جیسے تو۔ پھر پوچھا کہ یہ بتا میں تجھے کیسے ملا۔ تو پھر ارشاد ہوا جیسے خدا۔ . . اب ہندوستان کے فرمان روا نے زچ ہو کر کہا کہ یہ معمہ کیا ہے یہ تو سمجھا۔ صاحب کرامت فقیر بولا۔ دیکھو والیِ تخت و تاج اگر میں تجھ سے ملنا چاہتا۔ تو پہلے نہا دھو کر تیری محفل کے دستور کے مطابق لباس پہنتا پھر کسی سواری پر یہاں پہنچتا۔ یہاں پہنچ کر تیرے برق اندازوں کی خوشامدیں، اہلکاروں کی منتیں کرتا۔ درباریوں کی خدمتیں کرتا۔ اور پھر تجھ تک پہنچتا۔ تب تک خدا جانے طبیعت تجھے ملنے پر مائل رہتی کہ نہ رہتی۔ بس تمہارے دل میں تمنا جاگی

تو بلا صہل ہو گیا۔ چپ چاپ اپنے تک گھسیٹ لیا کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی اور ملاقات ہو گئی۔۔۔

خدا جانے یہ باغوں کا اثر تھا کہ علوم دینی کا عطیہ تھا ظفر کے دل میں یہ تمنا جاگ اٹھی تھی کہ اب رشوا سے کمند پھینک کر اٹھاتے ورنہ وصل سے ہجر بہتر۔۔۔ پہلے درجہ بدرجہ سلوک طے کرنے کے خواب دیکھتا تھا۔ اب ایک جذبۂ عشقی کا انتظار کرنے لگا جو ایک آن میں ساری منزلیں طے کرتا ہے۔

اسی جذبۂ غیبی کے انتظار میں چشم شبنم کی طرح تر وہ سیڑھیاں چڑھ رہا تھا شیو بڑھی ہوئی تھی۔ پتلون سے باغ جناح کی خشک گھاس کے تنکے چپٹے تھے۔ ہاتھوں اور کہنیوں پر سیلی مٹی کی ٹھنڈک تھی۔ لبوں پر کپل وستو کے شہزادے کی بانی تھی۔

اگر تمنا کا درخت کاٹ دو
تو اس کے تنے میں پھر حسرتوں کی کونپلیں نکل آتی ہیں۔
اگر تمنا کا درخت جڑ سے نہ کاٹو۔
تو دکھوں کی کونپلیں کیوں پھوٹیں گی؟
کیونکہ ہر تمنا کو ہمیشہ دکھ کی کونپلیں لگتی ہیں۔

ملک صاحب فائبر کا بریف کیس اٹھائے پیٹنٹ لیدر کے جوتے پہنے قائد اعظم جیسے لمبے دبلے بیرسٹروں کی طرح لوہے کی لاٹ بنے تیسری منزل سے نیچے اتر رہے تھے۔ ظفر اور ملک صاحب کی مڈھ بھیڑ اندھیرے زینے میں ہوئی

"سلام علیکم ابا جی . . ."

"وعلیکم . . . کہاں سے آئے ہو بھئی ؟"

"بس جی امتحان کی تیاری ہے ۔"

ملک صاحب سے آفٹر شیو لوشن اور لوڈی کولون کی خوشبو آ رہی تھی ۔

"پھر اچھی طرح ہو رہی ہے پڑھائی ؟"

"جی کوشش جاری ہے ۔"

"امید ہے فرسٹ کلاس تو آ جائے گی تمہاری . . ." ملک صاحب نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا ۔

ظفر کا کندھا اس گرفت تلے ایسا سُن ہوا ۔ جیسے سوکھے کی بیماری سے مارا گیا ہو ۔

"دیکھئے . . ."

"دیکھئے نہیں بھئی ضرور کہو . . . انشاء اللہ کہو . ."

ظفر ایک سیڑھی اوپر چڑھ گیا ۔ اسے نہ جانے کیوں اپنا باپ وہ گدھ سا نظر آیا جو پارسیوں کے مردہ گھاٹ کے ارد گرد منڈلایا کرتا ہے ۔

"تمہیں بہت محنت کرنی چاہئے ظفر ! ہمارے گھر میں تمام بزنس مین ہیں ۔ اظہر اور مظہر کو اللہ نے بہت کچھ دیا ہے لیکن . . . . لیکن میری تمنا ہے کہ تم سی ایس پی ہو جاؤ . . . یہ عزت ہو گی ہمارے لئے . . . اور کچھ مشکل بھی

نہیں تمہارے جیسے ذہین آدمی کے لیے۔۔۔"

"ابھی تو یہ ایم اے کا ہی فیصلہ نہیں ہو رہا آباجی۔"

"خیر خیر۔۔" ملک صاحب نیچے کی طرف اترنے لگے۔ "خیر خیر۔۔ خیر خیر۔"

"آپ۔۔۔ آپ فکر نہ کریں۔۔۔"

محبت کا ایک پرجوش ریلا اس کے دل میں گھستا چلا آیا۔ وہ جی میں سوچنے لگا یہ بوڑھا آدمی جو بظاہر نوجوان لگتا ہے۔ کس قدر خستہ ہے۔ اس کے کئی خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکے۔۔ شاید اس کی کوئی ایسی محبت بھی جو جو بار آور نہیں ہو سکی۔ اور جس کے بوجھ تلے یہ رات کو بہت بوڑھا نظر آتا ہے۔ کلاوہ اور ڈریسنگ گاؤن پہنے بیڈ لیمپ کی روشنی میں برٹرنڈ رسل پڑھتے ہوئے یہ آدمی کسی اندھیرے جزیرے کی طرح پراسرار سا لگتا ہے۔۔۔۔ ایسا جزیرہ جسے پانی کی ایک لہر سمندر اور دوسری واپس جاتی لہر خشکی میں بدل دیتی ہے۔

"آپ فکر نہ کریں۔۔۔۔ میں پوری کوشش کر رہا ہوں۔۔"

"یہی بہتر ہے۔۔۔" اترتے ہوئے ملک صاحب رک کر بولے۔

کندھوں میں ہلکا سا خم۔۔ بالوں میں گھلی ملی سیاہی۔۔۔۔۔ اسے نہ جانے کیوں یاد آیا؟

"اپنے باپ کی عزت کر

اپنے باپ کے لرزتے قدم دیکھ۔۔۔

دیکھ کہ یہ سایہ سورج غروب کے خوف سے لرز رہا ہے۔
دیکھ یہ سایہ شام کی ظلمت سے جھگڑ رہا ہے۔
دیکھ اور سوچ . . .
یہ سایہ کہیں تیرا اپنا سایہ تو نہیں . . .

جب ہی جی میں اس نے اپنے باپ کے لئے دعا مانگی۔ اپنے باپ کی خوشیوں کے لئے ہاتھ اٹھائے۔ اس کی تمنائیں بر آنے کی خواہش کی . . .

نچلے سیڑھی پر پہنچ کر ملک صاحب نے پلٹ کر اوپر والی سیڑھی پر نظر ڈالی . . لمحہ بھر کو ظفر کی طرف دیکھا اور منہ پھیر کر کہا۔

"تمہیں اپنا وعدہ یاد ہے نا . . ."

"جی . . ."

"امتحانوں کے بعد ہم خود تمہارا انتظام وہیں کر دیں گے . . بشرطیکہ تم نے چاہا . . . تب تک تم اسے کسی طرح تنگ نہیں کرو گے . ."

"جی . ."

ظفر کے دل میں نفرت کا دھواں نہ جانے کہاں سے گھس آیا۔ کوئی عورت جب محض مرد کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اس کے ساتھ سوتی ہے تو سحر کے وقت اس کے دل میں اس مرد کے لئے بالکل ایسی ہی نفرت اٹھتی ہے ایک ایک مسام سے گرمی کے پسینے کی طرح پھوٹتی ہوئی . . . باہر نکلتے ہوئے

سانس میں کاربن ڈائی آکسائڈ کی طرح گھلی ہوتی ... یہ نفرت مکڑی کے جالے کی طرح نازک لیکن فولاد کی طرح مضبوط ہوتی ہے۔ وہ بار بار خوشنودی حاصل کرتی ہے اور بار بار اس شکنجہ میں اپنا وجود کسواتی ہے۔ نہ خوشنودی کی گرہ نیم باز کھلتی ہے نہ نفرت کا بازار سرد پڑتا ہے۔ یہ دونوں کیفیتیں ہم طاقت لہروں کی طرح ایک ہی رفتار سے رواں کرتی سمندر کے وسط میں ملتی ہیں۔ اور پانی کی ایک ایسی ریڑھ کھڑی کر دیتی ہیں جو ایفل ٹاور سے مشابہ ہوتی ہے۔ اسی ایفل ٹاور کو سینے سے لگائے ظفر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

نہ جانے کیوں یکدم اس کی ہتھیلیاں جلنے لگی تھیں۔

جس وقت ملک صاحب کی کار میسن روڈ پر پہنچی اس وقت ڈمپل اور رشو جان کالج سے لوٹ کر باسی دال اور نان کباب کھا رہی تھیں۔ گھر پر ان دنوں کوئی ملازم نہ تھا۔ صبح جو کچھ پک پکا جاتا وہی کالج سے واپسی پر بھی کام آتا۔ ان دونوں کا معمول ہو چکا تھا کہ برابر کے پیسے ڈال کر واپسی پر نان کباب لے آتیں۔ اور چار سوا چار بجے کھانا کھاتیں۔ بغیر پردوں کی کھڑکی میں سے باہر جھانک کر ڈمپل نے پہلے دیکھا اور پھر اس نے جلدی سے دال سے لبالب بھرا تام چینی کا ڈبہ الماری میں بند کر دیا اخبار سمیت نان کباب لپیٹ کر رشو کے سرہانے تلے چھپا دیئے۔ اور دروازہ کھول کر باہر چلی گئی ...

"السلام علیکم ملک صاحب"

"السلام علیکم۔"

لمبی سیاہ گاڑی جس کے اندر لال گدیاں اور مستک پر سدرشن چکر سا لگا تھا پھاٹک کے عین سامنے کھڑی تھی۔ اور مودب وردی والا ڈرائیور رومال سے سامنے والا شیشہ صاف کر رہا تھا۔

"مس رشیدہ گھر پر ہیں۔۔۔"

"آپ آیئے تو سہی اندر۔۔۔"

"میں ادھر سے گذر رہا تھا تو مجھے یاد آگیا کہ آپ لوگ یہاں رہتی ہیں۔۔ میں۔۔"

ملک صاحب نے جلدی سے ایک جامع بہانے کی تلاش کی لیکن ذہن حاضر نہ تھا مجبوراً خاموش ہونا پڑا۔

"رشو۔۔۔ رشو ذرا باہر آؤ۔۔۔ رشو۔۔۔" کسی آپرا سنگر کی طرح پنجمی سُروں میں ڈمپل نے آواز دی۔

رشو باہر آئی تو اس کے ہونٹوں کے کنارے کبابوں کی تیزی کے باعث سرخ ہو رہے تھے۔ اور ناک پر پسینے کے قطرے جمے تھے۔

انہی دو باتوں پر ملک صاحب کی نظرِ تحسین پہلے پڑی۔

"السلام علیکم۔۔۔"

جانبین نے ایک دوسرے کا خیر مقدم کیا۔

"میں ادھر سے گذر رہا تھا۔"

"اندر آجائیے ملک صاحب۔"

"بس جی وقت کم ہے۔ مجھے فری مسین کی میٹنگ پر جانا ہے۔"

رشو خاموش کھڑی سوچ رہی تھی۔ شاید یہ اپنے ہونے والی بہو کا قریب سے جائزہ لینا چاہتے ہیں۔ شاید یہ مجھ سے اماں کا ایڈریس مانگنے آئے ہیں۔ شاید یہ اس بات کا اندازہ کرنے آئے ہیں کہ میں ظفر کو کس قدر پسند کرتی ہوں۔

"افسوس ابا جی اس وقت گھر پر نہیں ہیں۔۔۔ ورنہ۔۔۔"

"میں ان سے ملنے ضرور کسی دن حاضر ہو جاؤں گا۔۔۔ آپ لوگوں کو کسی جگہ چلنا ہو۔ تو۔۔۔ میری گاڑی حاضر ہے۔"

"جی نہیں ہم تو ابھی لوٹے ہیں جی کالج سے۔۔۔" رشو بولی

"اور ڈرامہ دیکھنے نہیں جانا اوپن ایئر میں۔۔۔" ڈمپل آہستہ سے بولی

"پھلے میں پہنچا آتا ہوں آپ کو۔"

"جی نہیں شکریہ ہم چلی جائیں گی۔"

"اگر آپ کو مجھ پہ اعتراض ہے تو۔۔۔ تو میں ٹیکسی پر چلا جاؤں گا۔ آپ کار پر چلی جائیں۔۔۔" معصومیت سے ملک صاحب نے کہا۔

"توبہ توبہ!۔۔۔ کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ ملک صاحب۔" رشو نے جلدی سے کہا۔

"تو پھر آئیے چلتے۔"

"ذرا ہم کپڑے تبدیل کر لیں۔" ڈمپل نے جلدی سے رشو کا بازو پکڑ لیا۔

ملک صاحب کو ٹوٹی ہوئی نواڑی کرسی پر بٹھا کر وہ دونوں اندر چلی گئیں۔ اس آدھ گھنٹے میں جب کہ ڈمپل اور رشو اندر تیار ہو رہی تھیں۔ ملک صاحب نے پہلے کوٹھی کا جائزہ لیا۔ ایک ہی نظر میں انہیں علم ہو گیا کہ اوپر والے حصے میں کوئی متمول شخص رہتا ہے۔ اور نچلے حصے کی کسمپرسی کا باعث مالک مکان کی تنگدستی ہے۔ اوپر والی منزل کے کمروں میں بڑے خوبصورت پردے ٹنگے ہوتے تھے۔ کمروں سے ریڈیو بجنے کی آواز آ رہی تھی۔ کھڑکیوں کا پینٹ پالش تازہ تھا۔ اور ایک کھلی کھڑکی میں سے ایک بڑے گلدان کے پھول نظر آ رہے تھے۔

جب ملک صاحب نے اس کوٹھی کے آگے ڈرائیور کو رکنے کے لئے کہا تھا تو وہ دل ہی دل میں کچھ سہمے ہوئے تھے۔ ڈمپل کو دیکھ کر ڈمپل کے گھر اور گھر والوں کا کچھ اور ہی نقشہ انہوں نے دل میں مرتب کیا تھا۔ لیکن اکھڑے ہوئے پلستر اور کھڑکیوں میں شیشوں کی جگہ گتے لگے دیکھ کر اندر ہی اندر ان کا حوصلہ زاویہ قائمہ پر کھڑا ہو گیا۔

ابھی تک وہ اپنے جذبات کا صحیح طرح تجزیہ نہ کر سکے تھے۔ انہیں پہلے تو رشیدہ پر ترس آیا۔ پھر اس لڑکی کی مدد کرنے کو دل چاہا۔ اور اب وہ اس آدھ گھنٹے میں اس لمبے کانوں والی لڑکی میں ایک ایسی کشش محسوس کرنے لگے تھے جو کششِ ثقل کی طرح نامعلوم اور یقینی ہوتی ہے۔

انڈر رشو نے جب ملک صاحب کی گاڑی میں جانے سے انکار کر دیا تو ڈمپل نے لیس کے دستانے اس کی طرف بڑھا کر کہا۔۔۔

"لو پہنو اور سیدھی طرح چلو۔"

"میں نہیں جا سکتی۔۔۔ اماں نے لکھا تھا کہ۔۔۔ کہ۔۔۔ میں۔۔۔ کسی کے ساتھ باہر نہ جاؤں۔۔"

ڈمپل نے ہنس کر کہا۔

"یہ کسی ہیں؟ ملک صاحب کسی ہیں؟۔۔۔ جنابہ محترمہ رشیدہ صاحبہ یہ تمہارے ہونے والے سسر ہیں۔"

"اگر تم ایسی باتیں کرو گی تو خدا قسم میں ہوسٹل چلی جاؤں گی۔"

ڈمپل سفید دستانوں والے ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئی۔

"اچھا بابا معافی۔۔۔"

"ہم کس طرح جا سکتے ہیں ان کے ساتھ۔"

"وہ اپنی میٹنگ پر جا رہے ہیں۔ فری میسن کی میٹنگ پر۔۔۔ ہم کو باغ جناح تک لفٹ دیں گے اور بس۔۔۔"

"یہاں سے تو ہم چل کر بھی جا سکتی ہیں اوپن ایئر تک۔۔۔"

"جو لطف مرسڈیز بنز میں سے اترنے کا ہے۔ وہ پیدل پہنچنے میں نہیں ہے۔"

رشو کے ٹرنکوں میں اماں کا وہ خط پھنکار رہا تھا۔ جو ابھی ہفتہ بھر پہلے اسے

ملا تھا۔ اس کے قدم اس خط نے جکڑ رکھے تھے۔

"دیکھو وہ ظفر کی بیوقوفی کی تلافی کر رہے ہیں۔ خود ہی سوچو اتنا معتبر معزز آدمی جب معافی مانگ رہا ہے تو تم خاردار تھوہر بن رہی ہو۔ خدا قسم یہ معافی مانگنے کا ایک ریفائنڈ طریقہ ہے۔ چلو۔۔۔ سیدھی طرح۔۔۔"

جب رشو چلنے پر آمادہ ہو گئی تو ڈمپل اس کے کپڑوں پر معترض ہوئی۔

"یہ کاٹن کی قمیض اور سفید دوپٹہ نہیں چلے گا۔۔۔ اتار دو اسے۔۔۔"

رشو کے لمبے کان جلنے لگے۔

"خدا قسم ٹھیک ہیں یہ کپڑے۔"

"سنو رشو! جب کبھی اسکورٹ کے بغیر کسی پبلک جگہ میں جاؤ تو ہمیشہ اتنے قیمتی لباس میں ہونا چاہیئے کہ کسی کو بات کرنے کی ہمت نہ پڑے۔ اور اگر کار میں سے اتر سکو تو اور بھی اچھا۔ معمولی آدمی قریب نہیں پھٹکتا۔۔۔"

"لیکن میں ساڑھی پہن کر نہیں جا سکتی مجھے ساڑھی کی عادت نہیں۔"

"عادت بھی پہننے سے ہوتی ہے۔ یہ معزز عورتوں کا فارمل ڈریس ہے۔۔ چلو پہنو۔۔۔"

"ڈمپل۔۔۔ خدا کے واسطے۔۔۔"

اور یہ لیں کے دستانے اور جوتے۔۔۔ کورٹ شو۔۔۔"

ساڑھی، دستانے اور جوتے پہن کر جب وہ ڈمپل کے سامنے آئی اور ڈمپل

نے اس کے چہرے کو بیوٹی کلینک کے حوالے کیا تو رشو آئینے والی صورت پر حیران رہ گئی۔ ڈسٹمپر کا کوٹ ختم ہوا تو جلد ساٹن کی طرح ملائم اور چمکدار ہو گئی۔ آنکھوں میں ایسی چمک پیدا ہو گئی کہ رشو کی اپنی نگاہیں آئینہ پر جمی رہ گئیں۔ وہ کسی لاکھوں پتی رئیس باپ کی ایسی بیٹی لگ رہی تھی جو سوئٹزرلینڈ سے پڑھ کر آئی ہو، جس کے باپ کی ملیں چلتی ہوں اور جو اپنے ذاتی سوئمنگ پول میں نہانے کی عادی ہو۔

وہ دونوں باہر نکلیں تو ملک صاحب کا جی چاہا کہ بندوقوں کی سلامی دیں۔ اور پرانے جانبازوں کی طرح گھٹنے ٹیک دیں۔ اس کے برعکس کار کا دروازہ بھی ڈرائیور نے کھولا۔ اور وہ پرانی کمانی کی عینک صاف کرتے اگلی سیٹ میں جا بیٹھے۔

اور پھر ایئر تھیٹر کی پہاڑی پر انہیں دائیں بائیں لے کر ملک صاحب اوپر پہنچے۔ تو نہ چاہتے ہوئے بھی فخر سے ان کی گردن بہت اونچی ہو چکی تھی۔ تھیٹر کی پتھریلی قطار میں گدیوں پر جب دونوں بیٹھ گئیں۔ اور اردگرد فرنٹیئر سینٹ بھیل ہی تو معذرت مانگ کر ملک صاحب اپنی میٹنگ پر چلے گئے۔

جب ملک صاحب کی کار فوجی میس کی زرد روشنی والی عمارت سے پاس کی تو پہلی بار ان کی نگاہ اپنے چہرے پر پڑی۔ سامنے رکھے چھوٹے آئینے میں انہوں نے اپنی عینک دیکھی۔ اس عینک کا فریم پیتل کا تھا اور پرانی وضع کا تھا۔ اس سے آنکھوں کا درمیانی فاصلہ تنگ نظر بنیوں کی طرح بہت چھوٹا نظر آتا تھا۔ ملک صاحب نے عینک اتار کر اپنا چہرہ دیکھا۔ پھر عینک لگائی۔ اپنی آنکھوں

کے گرد حلقوں پر نظر ڈالی۔ اور پھر ڈرائیور سے کہا۔

"علی بخش ذرا کار مال پر لے چلو۔"

علی بخش نے کار موڑی اور مال کی طرف روانہ ہو گیا۔

ابھی دوسرے ایکٹ کا پہلا سین شروع ہوا تھا کہ ملک صاحب واپس اوپن ایئر تھیٹر میں جا پہنچے۔ رشو انہیں دیکھ کر بھونچکی سی رہ گئی۔ ملک صاحب شام کو کچھ تھکے تھکے اور بڈھے سے نظر آ رہے تھے۔ لیکن اس نیم اندھیرے میں وہ حیرت انگیز حد تک ظفر سے مشابہ تھے۔

"میٹنگ جلدی ختم ہو گئی۔ . . . آپ . . . برا تو نہ مانیں گی اگر میں . . . بیٹھ جاؤں یہاں . . ."

عین سیڑھیوں کے پاس رشو کے بائیں ہاتھ ملک صاحب نے اپنی فوم ربڑ کی گدی رکھ دی۔

ڈھیلے نے چپس کا لفافہ ملک صاحب کو پیش کیا تو اس لفافے کو پکڑنے کے لئے چند ثانیے کے لئے ان کی کہنی رشو کے گھٹنے سے مس ہوئی۔ رشو نے جلد ہی سے گھٹنا نیچے کر لیا۔

"آئی ایم سوری . . ." ملک صاحب نے رشو کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

دوسرے ایکٹ کے تیسرے سین کے آخری جملے تک رشو سوچتی رہی کہ ملک صاحب میں اتنی کیا تبدیلی آ گئی ہے۔ اس سوکھی ڈال میں کہاں سے شگوفے نکل آئے ہیں

تیسرے سین کے بعد جب فل لائٹیں روشن ہوئیں اور ملک صاحب نے بیرے کو چائے کا آرڈر دیا تو رشو پر یکدم ملک صاحب کی جوانی کا راز کھلا۔

ملک صاحب کے چہرے پر پیتل کی کمانی والی عینک نہ تھی۔ بلکہ اس کی جگہ چوڑے فریم کی گلابی پلاسٹک کی ایسی عینک تھی جو ان کے دبلے چہرے کو بھرا بھرا اور کتابی بنا رہی تھی۔

انٹرول کے دوران ملک صاحب ڈمپل سے پہلے ایکٹ کی کہانی سنتے رہے پھر انہوں نے نہایت سنجیدگی سے کہنا شروع کیا۔

"رشیدہ بی بی! آپ بہاولپور سے نئی آئی ہیں۔ میں آپ کی شخصیت سے بہت متاثر ہوا ہوں۔ آپ کی جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو شاید میرے پاس آنے کی جرأت نہ کرتی لیکن ... آپ نے بہت راست گوئی سے کام لیا۔ ... میں آپ کو لاہور کے متعلق ایک نصیحت کرنا چاہتا ہوں۔ لاہور حلیم کی ایک دیگ ہے۔ اس میں ہر قسم کا اناج کھپ جاتا ہے۔ ہر طرح کی بولی گل جاتی ہے ... یہاں اگر آپ کو اپنی شخصیت بے داغ رکھنا ہے تو آپ کو بڑی کی طرح سخت بننا پڑے گا۔"

"جی..." رشو نے سعادت مندی سے سر جھکا کر کہا۔

"اس شہر میں اتنے بھانت بھانت کے پنچھی اور ایسے ایسے آوارہ اوباش جمع ہیں کہ آپ جیسی معصوم لڑکی کے لئے اس بحرِ بیکراں میں کھو جانا معمولی بات ہے۔"

"جی ..."

"میں ظفر کا باپ ہونے کی حیثیت سے . . . میری یہ ذمہ داری . . . یعنی میں اپنی ذمہ داری سمجھتا ہوں کہ آپ کی نگرانی کروں۔ آپ کا قیام لاہور میں آرام دہ ہو . . . اور . . . "

"جی . . . "

"آپ میری بات سمجھ رہی ہیں ناں؟"

"جی . . . "

"ظفر کو . . . آپ سے کیا تعلق ہے۔ اس کے لئے وقت درکار ہے۔ آپ پڑھ رہی ہیں۔ اس پڑھائی کے لئے آپ کو سکون اور فراغت کی ضرورت ہے۔"

"ہمارے گھر میں اسے ہر طرح سے سکون ہے۔"

"پھر بھی یہ بہاولپور سے آئی ہیں اور بہاولپور کا اپنا مزاج ہے . . . لاہور سے بہت مختلف . . . "

"جی . . . "

"اگر آپ کو کسی قسم کی کوئی تکلیف ہو . . . پیسے کی . . . یا کسی اور چیز کی تو . . . مجھ سے بلا تکلف کہیئے گا۔"

"جی . . . فی الحال تو . . . "

"میں یہ اس لئے کہہ رہا ہوں کہ میں ظفر کا باپ ہوں . . . میں . . . اسے اپنی ذمہ داری سمجھتا ہوں . . . "

"شکریہ . ."

"اور . . اور میں نادم بھی ہوں ظفر کی حرکتوں پر . ."

"جی کوئی بات نہیں . ."

جبڑے میں بتیاں بجھ گئیں۔ اور صرف سٹیج پر تیسرے ایکٹ میں چاندنی کھلی تو ملک صاحب نے آہستہ سے اپنا ہاتھ رشو کے ہاتھ پر رکھ کر پوچھا . . .

"آپ میرا مطلب سمجھتی ہیں ناں! ۔ میں چاہتا ہوں کہ جو تکلیف آپ کو ظفر کی وجہ سے ہوئی ہے۔ لاہور کے قیام میں دوبارہ آپ کو ایسی کوئی تکلیف نہ ہو . . ."

رشو نے جلدی سے اپنا ہاتھ اٹھا کر ڈمپل کے زانو پر رکھ لیا۔ اور سر جھکا کر بولی۔

"شکریہ جی . ."

"میرا مطلب ہے آپ لاہور کی زندگی سے واقف نہیں۔ میں ظفر کے باپ کی حیثیت سے کہتا ہوں آپکو ایسی پبلک جگہوں پر اسکورٹ کے بغیر نہیں آنا چاہیے۔"

راستے کو جب رشو اور ڈمپل لمبی سیاہ کار میں واپس گھر آئیں تو رشو کے منہ پر تالا پڑا تھا۔ بظاہر ملک کی کسی بات پہ برا ماننے کا کوئی جواز نہ تھا۔ پھر بھی اسے کچھ کچھ غصہ ملک صاحب پر کچھ اپنے آپ پر اور زیادہ ڈمپل پر آ رہا تھا۔ سونے سے پہلے ڈمپل نے پوچھا۔

"کیوں کیسا ڈرامہ تھا۔"

رشو چپ رہی۔

"کیوں کیسا ڈرامہ تھا؟"

"اچھا تھا . . ." مری سی آواز میں رشو نے کہا۔

"ملک صاحب بڑے بھلے آدمی ہیں . . ."

"ہوں؟ . . . . ہاں . . ."

"تم ان سے کچھ اچھی طرح پیش نہیں آئیں۔ کل کلاں کو وہ تمہارے فادر ان لا ہو گئے تو . . . تو اچھی بات نہیں ہے۔"

غصے سے رشو نے آنکھیں نچا کر کہا۔

"ایک بار کان کھول کر سن لو وہ میرے فادر ان لا نہیں ہوں گے . . . . سن لیا . . ؟"

"ہائے؟ اچھا بھئی تمہارا ذاتی معاملہ ہے میں کیا کہہ سکتی ہوں . . شب بخیر . . ."

"شب بخیر۔"

جب ڈمپل بیڈ لیمپ بجھا کر سو گئی تو یکدم رشو کو اپنے رویے پر تاسف ہونے لگا۔ ایسی محسن سے اس قدر بے رخی اور وہ بھی بلاوجہ . . اس نے جی ہی جی میں اپنے آپ کو بہت لعنت ملامت کی لیکن اتنی ہمت نہ پیدا کر سکی کہ اٹھ کر ڈمپل کے پلنگ تک جا سکتی۔ اور اس کا ہاتھ پکڑ کر کہہ سکتی۔

"آئی ایم سوری!"

زندگی بھر رشو میں یہی عیب رہا جب خوب ندامت میں بھیگ جاتی تو اندر ہی اندر کڑھتی لیکن ندامت کے اظہار کا کوئی راستہ نہ نکل سکتا۔ معذرت کا ایک لفظ منہ سے نہ نکلتا۔

بچپن میں اسے بزرگوں کو سلام کرنے سے بڑی شرم آتی تھی۔ ذرا گھر میں کوئی آجاتا تو وہ ٹرنکوں والی کوٹھڑی میں محض اس خوف سے چھپ جاتی کہ کہیں سلام نہ کرنا پڑ جائے۔ اماں اس کی اس عادت سے بہت نالاں تھیں۔ الٹا ایک ایک آدمی کو چار چار بار سلام کروائیں۔۔۔

ذرا بڑی ہوئی تو سلام کرنے کی عادت تو پڑ گئی لیکن ایک اور گانٹھ پڑ گئی۔ ذرا جو کسی دوست سے بول چال بند ہو جاتی تو مہینوں سلسلۂ کلام منقطع رہتا۔ ذرا سی پھانس مغلئی پھوڑے کی طرح رسنے لگتی۔ اگر ادھر سے صلح کا سفید جھنڈا بلند نہ ہوتا تو ادھر سے لاکھ چاہنے کے باوجود رشو کے لیے دوست کو منانے کی صورت نہ نکلتی۔ ایسا پرت دار حجاب پیدا ہو جاتا جو ہر دن گراونڈ گلاس کی طرح پکا اور اندھا ہوتا جاتا۔

کالج میں آکر بھی یہ عادت نہ گئی۔ وہ دوستوں سے ہمیشہ متفق رہنے کو اسی لیے ترجیح دیتی تھی کہ اگر خدانخواستہ دوست روٹھ گئی تو پھر منائے گا کون؟

ڈھیلے گہری نیند سو رہی تھی اور رشو پر گہری ندامت طاری تھی۔ اب ملک صاحب پر بھی غصہ باقی نہ رہا تھا۔ ہائے بھلا انہوں نے کیا کیا ہے۔ ہمدردی